استعمار زدگی کے تناظر میں "توبتہ النصوح" کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر سبحان اللہ، اردو لیکچرر، گورنمنٹ ڈگری کالج، لاہور، صوابی
فضل کبیر (پی۔ ایچ۔ ڈی سکالر)، اردو لیکچرر جہانزیب کالج، سوات

Abstract

The history of printing press in Urdu prose started in the era of British Colonialism in Subcontinent. As was the policy of the British Colonial Empire, historical facts were distorted and manipulated in a number of prosaic works. Several authors of Fort William College were the torchbearers in this regard. When the authors of post-colonial literature published their critiques of these works, many such critiques were labelled by the critics as the product the same policy of British Colonialism, which was not actually the case. One such literary work was the novel of Deputy Nazir Ahmad tilted as "TAUBA-TUN-NASUH" which is analyzed in this article.

Key Words: Urdu; Tuba-tun-nasuh;Istemar zadgi; Nazir Amad.

کلیدی الفاظ: توبتہ النصوح، استعمار زدگی، نذیر احمد

مقالے کا موضوع "استعمار زدگی کے تناظر میں "توبتہ النصوح" کا تجزیاتی مطالعہ "ہے۔ اس ناول کے پس منظر میں ان تاریخی حقائق کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے؛ جن کی وجہ سے اردو ادب نوآبادیاتی نظام کے زیر اثر آیا۔

مقالے کے دوسرے حصے میں اُن نقادوں کی تحریروں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے، جو توبتہ النصوح کو استعماری رجحان کا حامل ناول قرار دے چکے ہیں۔

تیسرے حصے میں نذیر احمد کے ناول کا از سرِ نو تجزیہ پیش کر کے، ما قبل ناقدین کے نظریات کے ساتھ اُس کا موازنہ کیا گیا ہے۔

طریقہ کار:

مقالے میں پہلے نو آبادیاتی پس منظر کو مد نظر رکھتے ہوئے مولوی نذیر احمد کے ناول توبتہ النصوح کا گہرا مطالعہ کیا گیا ہے، پھر ناول پر شائع شدہ تنقیدی مواد کا جائزہ لیا گیا ہے، اور اُن دستیاب تنقیدی مواد کو سامنے رکھ کر ذاتی مطالعے کی کسوٹی پر اپنی رائے پیش کی گئی ہے۔

تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو ہندوستان میں برطانوی دورِ استعمار کے دوران اردو زبان نشوونما کے ارتقائی

مراحل سے گزر رہی تھی۔ نثر میں ملا وجہی کی سب رس سے لے کر شاعری میں ولی دکنی جیسے ابتدائی تخلیق کار عہد استعمار ہی کے لکھاری ہیں۔ نظم و نثر میں کئی اصناف مثلاً انشائیہ، مضمون، ناول اور جدید نظم استعماری آقاؤں کی دَین ہے۔ادبی تاریخ کے سلسلے میں اس حقیقت سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۰ء) جو انگریز کا بنایا ہوا ادارہ تھا اردو میں مطبوعہ ادبی سرمایے کی بنیاد ثابت ہوا جہاں سے پہلی کتاب "باغ و بہار" (۱۸۰۲ء) شائع ہوئی۔تاریخ گواہ ہے کہ اپنے آپ کو دنیا کی مہذب ترین قوم کہنے والوں اور بقول شبلی (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) تاریخ انسانی کے اُستادوں نے علمی و ادبی سرگرمیوں کو بھی استعماری مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا۔بظاہر تو وہ ہندوستان پر تسلط کا جواز یہ پیش کرتے رہے: کہ ہم ان کو مہذب بنانے،ان کو جدید تعلیم اور جدید ٹیکنالوجی سے روشناس کروانے ہندوستان میں وارد ہوئے ہیں؛ جس کا تفصیلی ذکر ہابسن (۱۸۵۸ء-۱۹۴۲ء) نے اپنی کتاب (ایمپیریلزم اے سٹڈی (۱۹۰۲ء)) میں کیا ہے، لیکن اصل میں برصغیر لوٹنے کی غرض سے آئے تھے۔اس دوران ہر سال جتنا پیسہ ہندوستان سے انگلستان کے بینکوں میں منتقل ہوتا رہا، وہ ہندوستان کے فی کس آمدنی سے کئی گنّا زیادہ تھا۔اس لوٹ کھسوٹ کا اندازہ صرف بنگال میں لارڈ کلائیو (۱۷۲۵ء-۱۷۷۴ء) اور دیگر انگریز افسروں کی سازشوں سے بھی لگایا جا سکتا ہے؛ جب وہ میر جعفر (۱۶۹۱-۱۷۶۵) جیسے ملک دشمن سے مل کر نوابین منتخب کر رہے تھے۔رمیش دت (۱۸۴۸-۱۹۰۹) نے لکھا ہے کہ جب میر جعفر کو پہلی مرتبہ جنگ پلاسی کے بعد نواب بنایا گیا تو ۱۲۳۸۵۲۵ پاونڈ انگریز افسران نے اُن سے وصول کیے؛ جبکہ صرف لارڈ کلائیو کو ۳۱۵۰۰۰ پاونڈ کی خطیر رقم ادا کی گئی۔بنگلے اور جاگیریں اس کے علاوہ تھیں۔جب میر قاسم کو نواب بنایا گیا تو ۲۰۰۲۶۹ پاونڈز انگریزوں کو ادا کیے گئے۔جب میر جعفر کو دوبارہ نواب بنایا گیا تو ۵۰۰۱۶۵ اور جب نجم الدین دولہ کو نواب بنایا گیا تو ۲۳۰۳۵۶، پاونڈز کمپنی بہادر کے افسران کو ادا کیے گئے۔اس کے علاوہ آٹھ برسوں میں انگریزوں کو مزید 2159665 پاونڈ جمع کرنے تھے؛ جن کو بعد میں ۳۷۷۰۸۳۳ تک بڑھا دیا گیا۔(۱) نسیم حجازی (۱۹۱۴ء-۱۹۹۶ء) نے بھی اپنے ناول "معظم علی" میں افسانوی انداز میں ان حقائق کی طرف اشارے کیے ہیں۔

ایک ایسی سفاک اور مطلب پرست قوم سے یہ توقع رکھنا، کہ وہ مقامی زبان و ادب کی ترویج و ترقی اور تہذیب و تمدن کی بہتری کے لیے بغیر کسی فائدے کے ادارے قائم کر رہی تھی، ایک غیر دانشمندانہ خیال ہو سکتا ہے۔فورٹ ولیم کالج کے پس پشت استعماری پالیسی کے بنیادی عناصر یعنی فاتح قوم کا مفتوح قوم پر تعلیمی، تہذیبی، مذہبی، لسانی، ادبی، تاریخی، ثقافتی اور اقتصادی برتری جیسے عوامل کارفرما تھے۔انھی مقاصد کی روشنی میں دیکھا جائے، تو نوآبادکاروں کی جانب سے پہلی ادبی کاوش فورٹ ولیم کالج سے شروع کی گئی جہاں سے وابستہ مصنفین اور مترجمین منشی

کہلاتے تھے اور انگریز حکومت کے وظیفہ خوار تھے۔حیثیت تو اتنی تھی کہ جب میر امن جیسا بڑا منشی بھی ایک طالب علم کو ٹیوشن دینے سے انکار کرتا ہے تو اُنہیں نکال دیا جاتا ہے۔

کسی بھی زبان کے ادب اور بالخصوص نثر میں کسی قوم کا تمام تر تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی ورثہ موجود ہوتا ہے۔بد قسمتی سے ہمارے ہاں اس تحریری سرمایے کا آغاز ہی استعمار کی سرپرستی میں ہوا۔اس لیے ہماری تاریخ مسخ کر کے پیش کی گئی۔نثری اصناف میں ناول کی صنف انگریزوں کی زیر سرپرستی پھلی پھولی جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ استعماری دور کی ہر تخلیق استعمار زدہ اور ہر تخلیق کار استعمار کا متولی تھا۔بد قسمتی سے ہمارے ہاں جب اس دور کے ادب پر نو آبادیاتی پس منظر میں تنقید شروع ہوئی تو ہر لفظ کو شک کی نظر سے دیکھا گیا اور خوامخواہ کھینچ تان کر بعض تخلیقات پر استعمار زدگی کا لیبل چسپاں کر دیا گیا۔راقم الحروف کی نظر میں اُن تخلیقات میں ایک تخلیق ڈپٹی نذیر احمد (۱۸۳٦ء-۱۹۱۲ء) کا ناول "توبتہ النصوح" (۱۸۷۴) بھی ہے۔

ناول "توبتہ النصوح" اگرچہ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی اولاد کے لیے بہترین کتب دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے لکھا۔بقول اُن کے بڑی لڑکی کے لیے مراۃ العروس، چھوٹی کے لیے منتخب الحکایات اور بشیر کے لیے چند پند۔۔۔(۲) لیکن گورنر ولیم میور (۱۹۰۵-۱۸۱۹) کی طرف سے انعام ملنے، کاپیاں خریدنے اور کتاب پر اپنی رائے لکھنے سے ناقدین کے ذہنوں میں طرح طرح کے سوالات نے جنم لیا۔اگرچہ اس ناول کی اشاعت سے پہلے نذیر احمد کے دو مشہور ناول "مرآۃ العروس" (۱۸٦۹ء) اور "بنات النعش" (۱۸۷۲) شائع ہو چکے تھے۔وہ بھی انگریز سرکار کی طرف سے سراہے گئے تھے اور انعامات سے نوازے جا چکے تھے، لیکن استعمار زدگی کے حوالے سے کوئی خاص پہلو میسر نہ آنے کی وجہ سے یہ ناقدین کی بے جا تنقید سے محفوظ رہے۔

"توبتہ النصوح" میں بظاہر تو ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کی گئی ہے، جو دنیا کی عیش و عشرت میں اپنے خدا کو بھول جاتا ہے، یہاں تک کہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی اپنی اولاد کی تربیت اسلامی طرز پر کرنے سے قاصر رہتا ہے۔پھر شہر میں وبا پھیل جاتی ہے۔اور ہزاروں لوگ اس وبا کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔آخر میں وہ خود بھی وبا کا شکار ہو جاتا ہے۔بیماری کی حالت میں وہ خواب میں اپنے والد کو تکلیف میں دیکھتا ہے اور تائب ہو کر راہ راست پر آ جاتا ہے، لیکن اس کی یہ خود اصلاحی اب اُس کی بڑی بیٹی اور بیٹے کے حق میں بڑی مہنگی ثابت ہوتی ہے۔

ناول کی اشاعت پر انگریز سرکار کی طرف سے ایک ہزار روپے انعام دیا گیا اور میتھو کیمپسن (ڈائریکٹر تعلیمات عامہ) نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ترجمے کے بعد اس ناول کو یورپ ارسال کر دیا گیا۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی ڈپٹی نذیر احمد نے انگریز آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے یہ ناول لکھا تھا؟ کیوں کہ خود اُن کے اپنے

دعوے کے مطابق اچھی کتب کی عدم دستیابی کے باعث انہوں نے اپنے بیٹوں کے لیے یہ ناول لکھا، لیکن اس دعویٰ سے سے لارڈ میکالے (۱۸۵۹-۱۸۰۰) کے ہندوستانی علمی سرمایے کے بارے میں خیالات اور نظریات کی توثیق ہوتی ہے:

> ترجمہ "مجھے انگریزی اور سنسکرت زبانوں کا علم نہیں۔ لیکن مجھے اس کی اصل حیثیت کا اندازہ ہے۔ میں نے عربی اور سنسکرت کی چند اہم کتابوں کے تراجم پڑھے۔۔۔۔ میں نے اُن میں ایسی کوئی کتاب نہیں پائی جو میرے اس دعوے کو رد کرے کہ انگلستان کی لائبریری کے کسی ایک شیلف میں پڑی کتابیں تمام عربی اور ہندوستانی ادب سے بہتر ہیں۔"(۳)

یہاں کسی بھی سنجیدہ قاری کے ذہن میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے، کہ کیا ہندوستان میں ایک کتاب بھی ایسی نہیں تھی؛ جسے نذیر احمد بطور اصلاح اپنی اولاد کے سامنے پیش کرتے۔ آگے چل کر ناول میں مزید کچھ ایسے حالات و واقعات پیش آتے ہیں، جو استعمار زدگی کے بارے میں پڑھنے والوں کو مزید سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں، خاص طور پر جب نصوح کا چھوٹا بیٹا کلیم پادری صاحب سے کتاب لیتا ہے اور اس سے کافی حد تک متاثر بھی ہو جاتا ہے، جبکہ اس سے پہلے وہ کبھی کسی اسلامی کتاب سے اس قدر متاثر نہیں ہوا۔ اس طرح جب نصوح کا بڑا بیٹا کلیم گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور نصوح اُس کی ہندوستانی کتابوں پر مشتمل لائبریری کو جلا کر خاک کر دیتا ہے تو یہاں پر بھی قاری کے ذہن میں مختلف سوالات جنم لیتے ہیں۔ کہانی میں موجود اس قسم کے واقعات کو بنیاد بنا کر مختلف ناقدین نے اس کو استعمار زدگی کے رجحان کا حامل ناول قرار دیا ہے۔

اس حوالے سے استعمار اور نوآبادیات کے مباحث و نظریات پر دسترس رکھنے والے مشہور محقق و ناقد ڈاکٹر ناصر عباس نیر کا مقالہ "معنی واحد اور معنی اضافی کی کشمکش، نذیر احمد کے توبۃ النصوح کا مطالعہ "کافی اہمیت کا حامل ہے۔ ۴۶ صفحات پر مشتمل یہ مقالہ پہلی بار اورینٹل کالج میگزین کے ۱۲۳ ویں شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔ دوسری بار "اردو ادب کی تشکیل جدید" میں شامل کیا۔ ناصر عباس نیر نے نذیر احمد کے ناولوں کو ادبی اصولوں کے بجائے سیاسی حوالوں سے پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد کی تائید کرتے ہیں؛ جن کے مطابق ڈپٹی نذیر احمد کے پہلے دو ناول "مراۃ العروس" اور "بنات النعش" تحریک نسواں کے پرچار میں جبکہ "توبۃ النصوح" نوآبادیاتی بیانیہ کی تائید میں لکھا گیا ہے:

"یورپی تہذیب کی آفاقیت کا کبیری بیانیہ اگر کسی ایک جگہ سب سے زیادہ برگ و بار لائے تو وہ نئے تعلیمی نصابات تھے۔نذیر احمد کے تینوں ناول (مراۃ العروس، بنات النعش اور توبتہ النصوح"اس نئے تعلیمی نصابات کے سلسلے کے تحت لکھے گئے۔"(۴)

ناصر عباس نیر کے علاوہ پروفیسر افتخار احمد صدیقی بھی جو "مولوی نذیر احمد کے احوال و آثار" کے عنوان سے پی۔ایچ۔ڈی کر چکے ہیں، اس بات کو فرضی سمجھتے ہیں کہ نذیر احمد نے یہ ناول اپنے بچوں کی تربیت کے لیے لکھے ہیں۔بلکہ وہ اس بات کے زیادہ قائل نظر آتے ہیں کہ یہ ناول انگریز سرکار کو خوش کرنے اور اُن سے انعام و اکرام حاصل کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں۔انھوں نے مولوی نذیر احمد کے لیکچرز کی روشنی میں اُن کو ایک متشکک اور عیسائیت کی جانب رغبت رکھنے والی شخصیت قرار دیا ہے۔اُن کے بقول عیسائی مشنریوں نے جب وعظ و تبلیغ شروع کی تو بے شمار لوگ عیسائیت قبول کرنے کو تیار ہو گئے۔بعض کے دلوں میں اپنے مذہب کے حوالے سے تشکیک پیدا ہو گئی اور عیسائیت کی طرف مائل ہوئے نذیر احمد بھی اُن میں سے تھے۔وہ اپنے اُستاد رام چندر سے بے حد متاثر تھے جنہوں نے ہندو ازم کو چھوڑ کر عیسائیت اختیار کر لی تھی۔(۵)

پروفیسر محمد نعیم جو "اردو ناول اور استعماریت "(۲۰۱۷ء) کے نام سے اپنی کتاب شائع کر چکے انہیں کا بھی مذکورہ ناول کے بارے میں یہی بیانیہ ہے اور کسی حد تک جذباتی بھی دکھائی دیتے ہیں۔تاہم ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں اور بالخصوص توبتہ النصوح کے بارے میں مذکورہ بیانیے کی ترویج میں اولیت آصف فرخی کو حاصل ہے۔آصف فرخی نے اپنے مضمون "نصوح ہیضے سے کتاب سوزی تک" مشمولہ "عالم ایجاد" (۲۰۰۴ء) میں اس ناول کو مکمل طور پر استعماری ایجنڈے کا حصہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

ناول کا آغاز ہیضے جیسی مہلک وبا سے ہوتا ہے۔جو ناول نگار کی اپنی ذہنی اختراع ہے۔ناقدین کی رائے میں تو ناول برطانوی ناول نگار ڈینیل ڈیفو (۱۷۳۱-۱۶۶۰) کے ناول "دی فیملی انسٹر کٹر "(۱۷۱۵) کا چربہ ہے، لیکن ڈاکٹر اعجاز ارشد اپنی تحقیق میں اسے الزام قرار دیتے ہیں؛ اُن کے مطابق توبتہ النصوح نذیر کی اپنی تخلیق ہے اور اگر فیملی انسٹر کٹر کے ساتھ اس کی معمولی سی مطابقت ہے بھی تو وہ صرف چوتھے، پانچویں اور چھٹی فصل میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔(۶)

آصف فرخی (۱۹۵۹) نے اپنے مضمون میں استعماری بیانیے کی نشاندہی کی ہے ،وہ لکھتے ہیں: کہ ناول کی ابتداء ہیضے سے کیوں ،طاعون سے کیوں نہیں کی گئی؟ آصف فرخی اس حوالے سے اساطیر، انتظار حسین (۲۰۱۶-۱۹۲۳) کے ناول "بستی "(۱۹۵۸) اور غالب (۱۷۹۷ء-۱۸۶۹ء) کے نواب انوار الدولہ کے نام خط سے چند حوالے

دے کر ہیضے کا تعلق مذہب اور اخلاقیات سے جوڑ دیتے ہیں۔ ان کے مطابق عام ہندوستانیوں کا یہ عقیدہ تھا، کہ ہیضے میں پیٹ بھر کر لوگ مرتے ہیں(۷) ناصر عباس نیر صاحب (۱۹۶۵ء) بھی ہیضے کا تعلق ہندوستانیوں کے داغدار ماضی سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں؛ جس میں قے اور قبض کی تمثیل میں مولانا اس سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔(۸)

تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو پوری دنیا میں وبا اور بالخصوص ہیضے کا پھیل جانا اور اس کے ہاتھوں سینکڑوں لوگوں کا مر جانا کوئی نئی بات نہیں۔ جن ممالک میں صفائی کا خیال زیادہ رکھا جاتا تھا اور لوگ حفظان صحت کے اُصولوں سے زیادہ واقف تھے؛ وہاں ان بیماریوں کی شرح ضرور کم تھی اور آج بھی یہی صورت حال ہے۔ اب وبا کا تعلق استعمار اور ان کے پھیلاو کا تعلق استعماری مقاصد کے لیے بنائی گئی سڑکوں، پل، ٹنل اور ریلوے لائن سے باندھنا غیر متوازن اور جانبدار تنقیدی رویوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ اسی طرح نصوح جب خواب دیکھتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ایک بڑی کچہری میں محسوس کرتا ہے:

> "اتنی بڑی تو کچہری ہے مگر مختار اور وکیل کسی طرف دیکھنے میں نہیں آتے۔۔۔ غرض کیا مجال کہ کوئی اپنے بارے میں ناجائز پیری کر کے یا روپے پیسے کا لالچ دے کر سعی و سفارش بہم پہنچا کر کام نکال سکے۔ اگرچہ انصاف اور معاملہ فہمی اور ہمہ دانی کی وجہ سے حاکم کی ہیبت ادنیٰ و اعلیٰ سب پر چھائی ہوئی ہے مگر جتنے مجرم ہیں کیا خفیف کیا سنگین کوئی اس کے رحم سے نااُمید نہیں۔۔"(۹)

چوں کہ نذیر احمد خود عدالتی امور سے وابستہ رہے؛ اس لیے ناقدین نصوح کے خواب کا تعلق لاشعور سے جوڑ کر اس کا تانا بانا ہندوستان میں موجود انگریزی عدالتی نظام سے جوڑ دیتے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کہ نذیر احمد اُس عدالت میں ہندوستانیوں کے لیے خود کو مثال بنا کر مجرم ثابت کرتے ہیں اور اپنے کیے پر نادم نظر آتے ہیں۔ نیز وہ مستقبل میں انگریز کا مکمل وفادار غلام بننے کی کوشش میں بھی سرگرداں دکھائی دیتے ہیں۔

خواب کو بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں، کہ یہ کوئی عام عدالت نہیں جہاں رشوت اور پیسے کا بول بالا ہو۔ وہاں قاضی کوئی انسان نہیں خدا ہے، وکیل کی ضرورت نہیں کیوں کہ ہر شخص کے ہاتھ میں فائل ہے اور وہ اپنی صفائی خود پیش کرتا ہے۔ یہاں ناقدین نے ڈپٹی نذیر احمد کے لاشعور میں استعماری سوچ کی نشاندہی تو کر دی ہے، حالانکہ انسانی لاشعور پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والے مذہبی اور تہذیبی محرکات کو ان ناقدین نے یکسر نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے۔ قیامت کا دن یا روزِ حساب کسی بھی مسلمان کے بنیادی عقائد کا حصہ رہا ہے؛ مولانا نے انھی مذہبی عقائد

کی بنیاد پر قیامت کا منظر اور خدا کی عدالت کا منظر ناول میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے؛ جس کو ناقدین نے انگریز کی عدالت مراد لے کر ان نفسیاتی، تہذیبی اور مذہبی رویوں کی مکمل نفی کی ہے، جو کہ نذیر احمد کی زندگی کا بنیادی حصہ رہے ہیں۔ان تنقیدی آراء کو دیکھ کر یہ سوال بھی ذہن میں پیدا ہوتا ہے: کہ اگر انگریز کی عدالت حقیقت میں عدل و انصاف کی علامت تھی اور مظلوم کو واقعی انصاف مل رہا تھا، تو ہندوستانیوں کی طرف سے انگریزوں کے خلاف مزاحمت کا کیا جواز بنتا تھا؟ اور اسی مزاحمت کی وجہ سے مسجد کانپور (۱۹۱۳ء) اور جلیانوالہ باغ (۱۹۱۹ء) کا واقعہ کیوں پیش آیا؟ انگریزوں کی جانب سے مزاحمت کو کچلنے کے لیے ۱۹۱۹ء ایکٹ کیوں لاگو کیا گیا۔

ناول کے اُس حصے پر بھی اعتراضات اٹھائے گئے ہیں؛ جہاں نصوح کا چھوٹا بیٹا نعیم خوبصورت جلد کی غرض سے پادری صاحب سے کتاب لیتا ہے اور پھر اُس سے متاثر ہوتا ہے۔چوں کہ بنگال پر قبضے کے بعد عیسائی پادریوں کو ہندوستان آنے کی اجازت دے دی گئی تھی،اس لیے وہ یہاں آتے اور یہاں عیسائیت کا پرچار کرتے، مناظروں میں عقلی دلائل سے اپنے مذہب کو صحیح و برتر اور دوسرے مذاہب کو کمتر ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ سرسید کے "تہذیب اخلاق" اور "مقالات سرسید" میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے، کہ کس طرح انگریز آفیسر اپنے ماتحتوں کو مجبور کر کے پادری صاحب کے سامنے بٹھاتے تھے، جو عقلی دلائل کے ذریعے مسلمانوں کو ان کے مذہب سے متنفر کرنے کی کوشش کرتے۔اسلام کے مقابلے میں ہندومت کی بنیاد توہم پرستی پر مبنی ہے؛اس لیے بعض ہندوؤں نے عیسائیت اختیار کر لی جن میں نذیر احمد کے اُستاد رام چندر بھی شامل تھے۔اس تاریخی پس منظر میں عیسائی پادری سے متاثر ہونے کو شک کی نظر سے دیکھنا کوئی نئی بات نہیں ہے، لیکن ساتھ میں اپنے مذہبِ اسلام کی مبادیات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، کہ اچھی بات جہاں اور جس کی بھی ہو سیکھنی چاہیے۔

دیکھا جائے تو یہاں نذیر احمد نے نوآبادیاتی نصاب پر طنز کی ہے جس کی وجہ سے ہماری نئی نسل مذہب کے مبادیات سے محروم ہو گئی اور اس نصاب کے اثرات سے آج تک ہندوستانی قوم نجات حاصل نہ کر سکی۔ناول میں باپ بیٹے کے درمیان مکالمہ خاصی اہمیت کا حامل ہے؛ جس میں باپ اپنی اولاد کی صحیح تربیت نہ کرنے کا ذمہ دار خود کو اور مروجہ نصاب کو قرار دیتے ہیں:

> "مدرسے میں تاریخ و جغرافیہ و ہندسہ و ریاضی کے سوائے کوئی دوسری چیز پڑھاتے نہیں پھر دینی معلومات حاصل کیے تو کہاں سے کیں؟۔۔۔بیٹا: اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے چھوٹی سی عمر میں قرآن پڑھا تھا، لیکن وہ دوسرے ملک کی زبان ہے۔طوطے کی طرح اول سے

آخر تک پڑھ گیا مطلق سمجھ میں نہیں آیا۔۔مکتب گیا تو وہاں بھی کوئی دینی کتاب پڑھنے کا اتفاق نہ ہوا۔"(۱۰)

ناول میں سب سے قابل اعتراض عمل نصوح کی کتاب سوزی ہے۔جب نصوح کا بڑا بیٹا کلیم گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے، تو نصوح اُس کے کمرے کا رُخ کرتا ہے اور اُس کی لائبریری کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔کتابوں کا جلانا یقیناً قابل اعتراض عمل ہے؛ ناقدین نے اس عمل کو مولانا کی مشرقی علوم و فنون سے بیزاری کے مترادف گردانا ہے۔اس عمل سے یہ نتائج بھی اخذ کیے جاتے ہیں کہ استعماری آقاؤں کے زیر اثر مولانا ادب میں تکنیکی جدّت اور نئی اصناف کو مروج کرنے کے خواہش مند تھے، اسی لیے وہ قدیم اصناف سے اس قدر بیزار اور بد ظن ہو گئے تھے، کہ انھوں نے اس ادبی سرمایے کو ناول میں جلا کر سپرد خاک کر دیا۔کتابوں میں اگر شیخ سعدی کی کتاب "گلستان" کا نام لے کر تنقید کی گئی تو بیشک شیخ سعدی کی یہ کتاب انشاء پردازی کا ایک بہترین نمونہ ہے جس میں علم و حکمت کا ایک خزانہ موجود ہے لیکن اسی کتاب کے باب پنجم در عشق و جوانی اور باب ششم در ضعف پیری وغیرہ میں جو جنسی موضوعات چھیڑے گئے ہیں ان کو نیم پختہ ذہن کے بچوں کو پڑھانا کسی صورت مفید نہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ناول کے بعض واقعات نصاب اور مذہب کے حوالے سے استعمار زدہ ذہن کی عکاسی کرتے دکھائی دیتے ہیں، لیکن مولانا کی روایت شکنی کے اس عمل کو صرف انگریز نواز خیالات کا شاخسانہ قرار دینا کسی بھی صورت درست تنقیدی رویہ نہیں۔سر سید تحریک کے زیر اثر ہی جدّت پسند ذہنوں نے نہ صرف مشرقی ادبیات کی منفی اور غیر صحت مند رویوں پر قلم اٹھایا ہے، بلکہ بعد کے رومان پسندوں، ترقی پسند ناقدین اور مابعد جدیت سے وابستہ ادباء نے بھی ہمیشہ مشرق کی منفی تہذیب اور ادبی روایت کو ہدف تنقید بنایا اور غیر ضروری روایت پسندی کی ہمیشہ سے مخالفت کی۔نذیر احمد بھی اس سلسلے میں پیش پیش تھے لیکن ناقدین نے ان کی اس جدید ذہنیت پر مکمل طور پر استعمار زدگی کا الزام لگا کر یکسر فراموش کر دیا گیا ہے۔

مذکورہ ناول کو اگر اس تناظر میں دیکھا جائے کہ اس کے خالق ایک ہندوستانی مسلمان اور مولوی تھے، اُنھیں ادب سے زیادہ مذہب سے اُنس تھا۔لیکن جدید علوم کے حصول کے بعد انہوں نے کسی بھی روشن خیال فرد کی طرح فرسودہ ادبی، مذہبی اور تہذیبی روایات و خیالات کو تنقید کا نشانہ بنایا۔اُنھوں نے یہ ناول دراصل بچوں کی مذہبی اور اخلاقی تربیت جدید خطوط پر کرنے کی خواہش کے تحت تحریر کیا تھا، وہ اس سے بچوں کے مذکورہ بالا فرسودہ خیالات اور تصورات کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔تو پھر ناول استعمار زدگی کے الزام کی نفی کرتا ہے، جس کو نقادوں نے ہمیشہ ہدف تنقید بنایا ہے۔

حوالہ جات

1۔ Romesh Dutt,The Economic history of india,Vol,1,kegan paul LTD,1902,P,32,33

2۔ نذیر احمد، ڈپٹی، لیکچروں کا مجموعہ، جلد دوم، ص:۴۳۶

3۔ Thomas Babington Macaulay,Minute on Indian Education,February2,1835, Reprint. National Archives of India, 1965

۴۔ افتخار احمد، پروفیسر، مولوی نذیر احمد احوال و آثار، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۱، ص:۹۸

۵۔ افتخار احمد، پروفیسر، مولوی نذیر احمد احوال و آثار، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۱، ص:۹۷-۹۹

۶۔ اعجاز ارشد، ڈاکٹر، نذیر احمد کی ناول نگاری، وی آرٹس، پٹنہ، انڈیا، ۱۹۸۴، ص:۱۱۷

۷۔ آصف فرخی، عالم ایجاد، دی سمیع پرنٹرز، کراچی، ۲۰۰۴، ص:۲۶-۲۷

۸۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر معنی واحد اور معنی اضافی کی کشمکش، نذیر احمد کے توبتہ النصوح کا مطالعہ، اورینٹل کالج میگزین، شمارہ، ۱۲۳، ص:۱۱۹

۹۔ نذیر احمد، ڈاکٹر، توبتہ النصوح، بک ٹاک، لاہور، ۲۰۱۲، ص:۱۲

۱۰۔ ایضاً، ص:۸۳